کے باساروف* (Basarov) کے سچے پیروکار ہیں جو کسی بھی مقصد یا مقصد کے بغیر بھی سرگرم ہو سکتے ہیں: ہمیں دہشت گردی کرنا ہے، مقصد و فائدہ ہماری بلا جانے۔ روسی لا وجودی (Nihilist) مصنف دمتری پیساریف (Dmitri Pisarev) کے لافانی الفاظ میں: ''یہ ہے ہمارے کیمپ کا الٹی میٹم: جو توڑا جا سکے، اسے توڑ ڈالنا چاہیے، جو حملے کے آگے ٹھہر سکے، وہ اچھا ہے، جو ریزہ ریزہ ہو جائے، وہ بے کار ہے، کسی بھی حال میں، دائیں اور بائیں دونوں پر ضرب لگاؤ، اس سے کچھ نقصان نہ ہوگا اور نہ ہو سکتا ہے''۔

اللہ اکبر

[*ابو الراوندی (Ibu-al-Rawandi) تصوف اور عالمی مذہب کا ایك طالب علم ہے۔ کئی برس تك اس نے ایك مسلمان کی طرح زندگی گزاری اور ایك صوفی شیخ کا مرید رہا۔ وہ ایك کتاب *Islmic Mysticism: A Secular Perspective* کا مصنف ہے۔ اس کے علاوہ اس کے متعدد مضامین مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے ہیں۔ ابو الراوندی لندن، برطانیہ میں رہائش پذیر ہے۔]

* بارساروف ایک روسی ناول کا مرکزی کردار تھا جسے ۱۸۶۲ء میں ایوان ترگنیف (Ivan Turgenev) نے لکھا تھا۔ یہ کردار روسی لا وجودی فلسفے (Nihilism) کی اس وقت ابھرتی ہوئی تحریک کا پہلا ترجمان کردار تھا۔ اس فکر کے مطابق کسی سماجی نظام کو تہ و بالا کر ڈالنا چاہیے بغیر اس تردد کے کہ کون سا نظام اس کی جگہ لے گا۔

دہشت گردوں کا اگلا ہدف: دنیائے جدید

تحریر: فرانسس فوکو یاما*

ترجمہ: کرنل (ر) غلام سرور

قرائن سے یوں دکھائی دیتا ہے کہ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو رونما ہونے والے خونچکاں واقعات نے عالمی سیاست کا رخ یکسر بدل دیا ہے۔ اس حادثہ سے قبل، امریکہ ترقی کی منازل تیزی سے طے کر رہا تھا، کمیونزم کے روپ میں اس کا ایک توانا حریف دم توڑ چکا تھا۔ دنیا میں جمہوریت کے پنپنے کی راہ ہموار ہو گئی تھی۔ اس سے قبل فاشزم اور بادشاہت کا فرسودہ نظام بھی اپنے منطقی انجام کو پہنچ چکا تھا۔ ۱۱ ستمبر سے قبل، امریکی معیشت پھل پھول رہی تھی اور جمہوری ادارے اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود نہ صرف امریکہ بلکہ پوری دنیا میں برگ و بار لا رہے تھے۔ ٹیکنالوجی کے شعبے میں حیرت انگیز ترقی کے طفیل زمینی فاصلے سمٹ رہے تھے اور قومیت پر مبنی ریاستوں (nation states) کے قیام کا تصور قصۂ پارینہ بنتا جا رہا تھا۔ لیکن آج ہر چیز مختلف دکھائی دے رہی ہے۔

امریکہ نے خود اپنی سرزمین پر بے مثال کامیاب حملوں کے بعد طالبان اور القاعدہ کے خلاف افغانستان میں جنگ شروع کر دی۔ مسلمانوں کی بڑی اکثریت امریکہ مخالفت میں متحرک ہو چکی ہے اور دنیا کے ممالک کو کہا جا رہا ہے کہ وہ اس جنگ میں اپنی اپنی حیثیت کا تعین کریں کہ وہ کس کے ساتھ ہیں۔ امریکہ اور امریکہ سے باہر معیشت ہر جگہ انحطاط کا شکار ہو چکی ہے، کیونکہ سلامتی سے متعلق خدشات نے معیشت کی ترقی کی رفتار کو شدید دھچکا پہنچایا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ آخر کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہم آج سے کچھ عرصہ قبل پیش کیے جانے والے نظریے ''تہذیبوں کے تصادم'' (Clash of Civilization) کی عملی تفسیر دیکھ رہے ہیں، جس

* Francis Fukuyama, "Their Target: The Modern World (the Real Enemy)", *Newsweek*, Special Daves Edition, Dec. 2001 - Feb. 2002, pp. 54 - 59.

میں مغرب کو اسلام کے مقابل کھڑا کر دیا گیا ہے۔ایک ایسا تنازع جو افغانستان کے میدان جنگ سے نکل کر دنیا کے بڑے حصے کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے؟ کیا وہ ٹیکنالوجی جس کے بارے میں خیال تھا کہ وہ آزادی کو فروغ دے گی، مثلاً ہوائی جہازوں، بلند و بالا عمارتوں (skyscrapers) اور علم حیاتیات کی تجربہ گاہوں میں اضافہ ہوگا، وہ ایسے طریقوں سے ہمارے خلاف ہو چکی ہے کہ ہم اب مکمل طور پر اس کا راستہ روک بھی نہیں سکتے؟ کیا یہ امید کی جا سکتی ہے کہ اسامہ بن لادن، طالبان اور دہشت گردی کے نیٹ ورک کے خاتمے کے بعد ایک دوسرے کو جوڑنے والی عالمی معیشت کی پرانی دنیا بحال ہو جائے گی؟

آج سے کوئی دس سال قبل راقم الحروف (فوکویاما) نے اپنا ''تاریخ کے نقطۂ انتہا'' (End of History) کا نظریہ پیش کیا تھا کہ انسانیت نے ارتقائی منازل کچھ اس انداز سے طے کر لی ہیں کہ اب وہ تاریخ کی بساط لپیٹ دینے کے مدار میں داخل ہو چکی ہے۔اس دعویٰ سے میری مراد ہرگز یہ نہ تھی کہ اب تاریخ کا حرکی عمل بالکل منجمد ہو کر رہ جائے گا۔میرا مقصد صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ تاریخ جسے بالعموم حکومت کی مختلف شکلوں کے ساتھ انسانی معاشروں کے ارتقاء کے تناظر میں سمجھا جاتا تھا، جدید آزاد رُو جمہوریت اور منڈی کی معیشت سے جنم لینے والے سرمایہ دارانہ نظام کے فروغ کے ساتھ ہی اپنے عروج کو پہنچ چکی ہے۔میرا خیال ہے کہ میرا یہ نظریہ ۱۱ ستمبر کے واقعات کے باوجود اپنی جگہ پر درست ہے۔امریکہ اور دیگر ترقی یافتہ جمہوریتیں جس جدیدیت کی نمائندگی کرتی ہیں، عالمی سیاست میں اس کا وجود غالب طاقت کے طور پر موجود رہے گا۔دنیا بھر میں ان اداروں کا فروغ جاری رہے گا جن کی تشکیل مغرب کے اساسی اصولوں یعنی ''آزادی'' اور ''مساوات'' کی مرہون منت ہے۔

لیکن ہمیں اس چیلنج کو سنجیدگی سے سمجھنے کی ضرورت ہے جس کا فوری طور پر سامنا ہے۔ایک ایسی تحریک، خواہ اس کی نمائندگی لوگوں کی ایک محدود تعداد ہی کیوں نہ کر رہی ہو، اگر جدید دنیا کو شدید ترین نقصان پہنچانے کی طاقت رکھتی ہے تو اس امر سے ہماری تہذیب کی نمو پذیری کے حوالے سے حقیقی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امریکیوں کو جس کلیدی سوال کا سامنا ہے وہ یہ ہے کہ دہشت گردی کا یہ بنیادی چیلنج کتنا گہرا ہے، کون کون اس میں ہمارا اتحادی بن سکتا ہے اور اس کے مقابلے کے لیے کیا کچھ کرنا ہمارے لیے ناگزیر ہے؟

تہذیبوں کا ایک تصادم

معروف مفکر اور دانشور سیموئیل ہنٹنگٹن (Samuel Huntington) کا کہنا ہے کہ حالیہ دور میں رونما ہونے والی یہ کشمکش، آگے چل کر تہذیبوں کے تصادم کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ جس کی پیشین گوئی انہوں نے برسوں پہلے کی تھی کہ ایسا تصادم سرد جنگ کے بعد کی دنیا کو تہ و بالا کر سکتا ہے۔ اگر چہ بش انتظامیہ کا یہ کہنا بجا ہے کہ موجودہ لڑائی دہشت گردوں کے خلاف ہے نہ کہ اسلام اور مغرب کے درمیان جنگ، تاہم اس جنگ میں ثقافتی وتہذیبی مسائل کا عمل دخل واضح نظر آتا ہے۔

امریکیوں کو یقین ہے کہ جمہوریت، انفرادی حقوق، قانون کی حکمرانی اور معاشی آزادی سے حاصل شدہ خوشحالی پر مبنی ان کے ادارے اور اقدار عالمی سطح پر انسانوں کی توقعات اور خواہشات کی مجموعی طور پر نمائندگی کرتے ہیں اور اگر موقع ملا تو یہ دنیا بھر کے انسانوں کی آواز بن جائیں گے۔ وہ یہ سوچنے پر مائل ہیں کہ امریکی معاشرہ تمام ثقافتوں کے لوگوں کے لیے کشش رکھتا ہے۔ دنیا کے تمام ممالک سے لکھوکھا آبادکاروں کی امریکی اور دیگر ترقی یافتہ معاشروں میں آمد ہی اس حقیقت کا ثبوت ہے۔

لیکن ۱۱ ستمبر کے بعد رونما ہونے والے واقعات اس نقطۂ نظر کو چیلنج کرتے ہیں۔ محمد عطا اور جہاز اغوا کرنے والے اس کے دیگر ساتھی سب کے سب تعلیم یافتہ نوجوان تھے جو مغرب میں رہے اور مغربی درس گاہوں میں جنہوں نے تعلیم پائی۔ نہ صرف وہ مغرب سے متاثر نہ ہوئے بلکہ ان کا ردِعمل اتنا شدید تھا کہ وہ جہازوں کو عمارتوں سے ٹکرانے اور ان ہزاروں لوگوں کو ہلاک کرنے کے لیے تیار ہو گئے جن کے درمیان وہ رہتے رہے تھے۔ یہاں ثقافتی فاصلہ، اسامہ بن لادن اور اس کے ساتھی اسلامی بنیاد پرستوں کی مثالوں کے ذریعے، مکمل اور بھرپور دکھائی دیتا ہے۔ تو کیا یہ ثقافتی لحاظ سے محض ہماری کوتاہ بینی ہے کہ ہم مغربی اقدار کو عالمی اقدار تصور کر بیٹھے ہیں؟

تاریخ کی منطق

درحقیقت اس یقین کی وجوہات موجود ہیں کہ مغربی اقدار اور ادارے، اگر بہت سے غیر مغربی لوگوں کے لیے نہیں تو بھی اکثر انسانوں کے لیے بے پناہ کشش رکھتے ہیں۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا

سکتا کہ جمہوریت اور سرمایہ داریت کا مسیحیت سے تاریخی رشتہ ہے۔ نہ ہی اس حقیقت کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ جمہوریت کی ثقافتی جڑیں یورپ میں ہیں۔ جیسا کہ ایلیکس ڈی ٹکیا ولی اور جارج ہیگل سے فریڈرک نٹشے تک مفکرین نے نشان دہی کی ہے کہ جدید جمہوریت، عالمی انسانی مساوات کے مسیحی عقیدے کی لادینی شکل (secularized version) ہے۔

تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مغربی ادارے سائنسی طریقہ کار کی مانند ہیں جو دریافت تو مغرب میں ہوئے ہیں لیکن اپنے اندر عالمی سطح پر ہر جگہ منطبق ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ایک تاریخی عمل (historical mechanism) ایسا ہے جس کے تحت مختلف ثقافتی سرحدوں کے مابین طویل المدت تبدیلی انجام پاتی ہے۔ سب سے پہلے اور زیادہ طاقت کے ساتھ اقتصادیات میں، پھر سیاست کی اقلیم میں اور پھر بالآخر ثقافت میں۔ اور یہ آخری تبدیلی بعینہٖ نہیں بلکہ زیادہ فاصلاتی ہے۔

سب سے پہلے یہ عمل جدید سائنس اور ٹیکنالوجی سے آگے بڑھتا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں مادی دولت اور جنگ کے ہتھیار پیدا کرنے کی صلاحیت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ عملاً تمام معاشرے اسے لازماً حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ٹیکنالوجی مسلمانوں اور چینیوں کے لیے بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی مغرب کے لوگوں کے لیے اور اس پر عبور حاصل کرنے کے لیے پیداوار میں اضافہ کرنے والے آزاد معیشت اور قانون کی حکمرانی جیسے مخصوص معاشی اصولوں اور اداروں کا اختیار کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی سے فروغ پانے والی مارکیٹ اکانومی فرد کی آزادی کی بنیاد پر پھلتی پھولتی ہے۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جس میں حکومتوں یا مذہبی علماء کے بجائے افراد قیمتوں اور شرح سود کا تعین کرتے ہیں۔

معاشی ترقی جواب میں آزادرَو جمہوریت کی وجہ بنتی ہے۔ اگرچہ یہ ہر صورت میں لازمی نہیں تاہم اکثر صورتوں میں ایسا ہی ہوتا ہے کیونکہ ترقی اور جمہوریت میں تعلق کو علم سیاسیات کے چند عمومی طور تسلیم شدہ اصولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ معاشی ترقی سے ایک حقِ جائیداد رکھنے والا متوسط طبقہ اور ایک پیچیدہ اور آزادرَو معاشرہ (civil society) جنم لیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تعلیم کی شرح بہت بلند ہو جاتی ہے تاکہ اس معاشی ترقی کی رفتار برقرار رہے۔ یہ تمام عوامل وہ زرخیز فضا پیدا کرتے ہیں جس میں جمہوری سیاسی شراکت کے مطالبے زور پکڑتے ہیں اور بالآخر جمہوری حکومت کے قیام پر منتج ہوتے ہیں۔

ثقافت جس میں مذہبی عقائد، سماجی عادات اور قدیم روایات شامل ہیں، سب سے آخر میں تبدیل ہوتی ہے اور یہی سب سے کمزور میدان بھی ہے۔ معاشرے گہری جڑیں رکھنے والی اقدار کو چھوڑ دینا پسند نہیں کرتے اور یہ سوچنا بہت سادگی ہوگی کہ امریکی مقبول ثقافت، جو اگرچہ ترغیب انگیز ہے، اتنی جلدی ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ یقیناً میکڈونلڈ اور ہالی ووڈ نے دنیا بھر میں عالمگیریت کے امکانات کے خلاف قابل لحاظ ردعمل پیدا کیا ہے۔

لیکن جدید معاشروں میں جہاں ثقافتی اختلافات موجود ہیں، وہاں انہیں سیاست سے باہر اور انسان کی ذاتی زندگی کی حدود میں رکھنے کا رجحان ہے۔ اس کی وجہ بہت سادہ سی ہے: اگر سیاست کی بنیاد مثلاً مذہب پر ہو تو کبھی بھی امن کا برقرار رکھنا ناممکن ہوگا کیونکہ لوگ بنیادی مذہبی اقدار پر متفق نہیں ہو سکتے۔

مغرب میں ایک لحاظ سے سیکولرزم ایک حالیہ پیش رفت ہے۔ یورپ میں مسیحی حکمران اور پادری خود کو اپنی رعایا کے مذہبی عقائد کے تحفظ کے ذمہ دار تصور کرتے تھے اور اختلاف کرنے والوں کو سزا دیتے تھے۔ جدید سیکولر جمہوری ریاست یورپ میں سولہویں اور سترہویں صدی کے خونی مذہبی تنازعات سے ابھری ہے جن میں مختلف مسیحی گروہوں نے بے رحمی سے ایک دوسرے کا قتل عام کیا۔ چنانچہ شہریوں میں امن کو قائم کرنے کے لیے چرچ اور ریاست کی علیحدگی ایک ضرورت بن گئی جو جدیدیت کے عمل کا ایک لازمی حصہ ہے۔ یہی وہ حیران کن نظریہ ہے جو ہابس اور لاک نے کمال مہارت سے پیش کیا ہے اور جو امریکی اعلانِ آزادی اور امریکی آئین کی صورت میں منتج ہوا ہے۔

جدیدیت (modernization) کی تہہ میں یہی وہ منطق ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغربی اقدار مغربی مسیحیت سے نکلنے والی کوئی خودسر ثقافتی شاخیں نہیں ہیں بلکہ ان میں ایک زیادہ عالمگیر عمل (universal process) متشکل ہوا ہے۔ چنانچہ ہمارے سامنے سوال یہ ہے کہ کیا دنیا میں ایسی ثقافتیں یا ممالک موجود ہیں جو جدیدیت کے اس عمل کی راہ میں مزاحم ہوں گے؟ یا اسے روک دیں گے؟

مغرب بمقابلہ دیگر دنیا

اگر ہم ایشیا پر نگاہ ڈالیں تو وہاں ہمیں جدیدیت کی راہ میں خاص ناقابل عبور رکاوٹیں نظر نہیں آتیں۔ سنگاپور کے سابق وزیراعظم لی کوان یو کہا کرتے تھے کہ ایشیائی قدریں مطلق العنانیت کی حمایت کرتی ہیں نہ کہ جمہوریت کی۔ لیکن حالیہ برسوں میں جنوبی کوریا اور تائیوان نے دولت مند ہونے کے ساتھ ساتھ جمہوریت کی طرف پیش قدمی کی ہے۔ بھارت ۱۹۴۸ء میں اپنی آزادی سے لے کر اب تک کامیاب جمہوریت ہے۔ اور حال ہی میں اس نے معاشی اصلاحات کا سلسلہ شروع کیا ہے جو غربت سے نکلنے میں بھی اس کی مدد کر سکتا ہے۔

لاطینی امریکہ اور یورپ کی سابق کمیونسٹ ریاستوں میں ثقافتی رکاوٹیں اور بھی کم ہیں۔ ان کا مسئلہ جدیدیت کا مقصد حاصل کرنے میں عملاً ناکامی کا ہے جبکہ انہیں جدیدیت کی منزل سے بطور مقصد کوئی اختلاف نہیں ہے۔ تحت صحارا افریقہ میں ایڈز سے لے کر خانہ جنگی اور بُری حکومت تک کئی مسائل ہیں۔ لیکن یہ دیکھنا مشکل ہے کہ وہاں کی متنوع ثقافتی روایات اپنے معاشروں کو جدید بننے سے کیسے روک سکیں گی، اگر وہ دیگر معاملات میں اکٹھے ہو کر اپنے کام کرنے لگیں۔

صرف اسلام دنیا کی وہ واحد ثقافت ہے جسے جدیدیت کے ساتھ کچھ بنیادی مسائل درپیش ہیں۔ البتہ اس پر بحث کی گنجائش موجود ہے۔ مسلمان معاشرے اپنی تمام تر مہارت اور اہلیت کے باوجود صرف ایک عملی جمہوریت (ترکی) پر کچھ فخر کر سکتے ہیں جبکہ انہوں نے کوریا اور سنگاپور کی طرح کوئی زبردست معاشی کامیابی بھی حاصل نہیں کی ہے۔

اسلام کیسے مختلف ہے؟

یہ لازمی نہیں کہ اسلام میں بطور مذہب کوئی ایسی شے ہے جو اسے جدیدیت کا دشمن بناتی ہے۔ عیسائیت، ہندوازم، کنفیوشسزم یا دنیا کی دیگر عظیم مذہبی یا ثقافتی روایات کی طرح، اسلام بھی غیر معمولی پیچیدگی کا حامل ایک نظام ہے جس نے وقت کے ساتھ ساتھ کئی انداز میں ارتقاء کے مراحل طے کیے ہیں۔ جس دوران مسیحی یورپ مذہبی خانہ جنگی کا شکار تھا مسلمانوں کے مختلف فرقے خلافت عثمانیہ کے تحت پرامن

زندگی گزار رہے تھے۔ انیسویں اور اوائل بیسویں صدی میں مصر، ایران اور ترکی کے اسلام میں اہم لبرل رجحانات موجود تھے۔ کمال اتاترک کی جمہوریہ ترکی انہی رجحانات کے نتیجے میں جدید تاریخ کی مکمل سیکولر ریاستوں میں ایک ریاست بن گئی۔

اسلامی دنیا آج کی دیگر ثقافتوں سے ایک اہم حوالے سے مختلف ہے۔ حالیہ سالوں میں واحد اس مذہب نے بار بار اہم انتہا پسند اسلامی تحریکوں کو جنم دیا ہے جو محض مغربی پالیسیوں کے خلاف نہیں ہیں بلکہ جدیدیت کے ایک انتہائی بنیادی اصول یعنی مذہبی رواداری کو بھی رد کرتی ہیں۔ ان گروہوں نے ۱۱ ستمبر کے سانحے پر اس لیے خوشیاں منائیں کیونکہ اس واقعہ سے اس معاشرے کو نقصان پہنچا جو ان کے خیال میں اپنی بنیاد سے ہی خراب ہے۔ یہ خرابی صرف جنسی آزادی، ہم جنس پرستی اور خواتین کے حقوق سے متعلق نہیں ہے بلکہ سیکولرزم کے بارے میں ان کے خیالات اس کا سبب ہیں۔

انہیں اس چیز سے نفرت ہے کہ مغربی معاشروں میں ریاست مذہبی سچائی کے تحفظ کے بجائے مذہبی برداشت اور کثرتیت (pluralism) کو تقویت پہنچاتی ہے۔ ایشیا، لاطینی امریکہ، سابق اشتراکی ریاستوں یا افریقہ کے عوام مغربی صارفیت پسندی (consumerism) پر مبنی اقدار میں کشش محسوس کرتے ہیں اور ان کے لیے اگر ممکن ہو تو انہیں اپنے ہاں بھی رائج کرنا چاہتے ہیں جبکہ سعودی وہابیوں، اسامہ بن لادن یا طالبان جیسے بنیاد پرست انہیں مغربی زوال کا ایک ثبوت سمجھتے ہیں۔

چنانچہ یہ محض دہشت گردوں کے خلاف ایک جنگ نہیں ہے جیسا کہ امریکی حکومت قابل فہم طور پر کہتی ہے نہ ہی اصل مسئلہ فلسطین یا عراق کے بارے میں امریکی پالیسی کا ہے، جیسے بہت سے مسلمان دعویٰ کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے بنیادی اختلاف یا تنازعہ بہت گہرا ہے اور اس کا تعلق صرف دہشت گردوں کے ایک چھوٹے سے گروپ سے نہیں ہے بلکہ انتہا پسند اسلامیوں اور مسلمانوں کے ایک کہیں بڑے گروپ سے ہے، جن کے نزدیک مذہبی شناخت دیگر سیاسی اقدار سے کہیں زیادہ اہم ہے۔

یہ انتہا پرست اسلامیت (radical islamism) ہی ہے جو شکایتوں، دکھوں اور محرومیوں کے احساس کا وہ پس منظر تشکیل دیتی ہے جو نہ صرف بہت گہرا ہے بلکہ مقابلتاً حقیقت سے کٹا ہوا بھی ہے۔ یہ اسی طرح کا اسلام پسند ہے جو یہ یقین کرنے کے لیے تیار نہیں کہ عالمی تجارتی مرکز پر حملے میں مسلمان

ملوث تھے بلکہ اسے اسرائیل کی کارستانی قرار دیتا ہے۔ وہ امریکی پالیسی پر اعتراض کرتے ہیں بلکہ وہ اسے مسلمانوں کے خلاف بہت بڑی سازش کا حصہ قرار دیتے ہیں۔ اور یہ بھول جاتے ہیں کہ ماضی میں امریکی پالیسی نے صومالیہ، بوسنیا، کوسووا اور چیچنیا میں مسلمانوں کی حمایت اور مدد کی ہے۔

اگر ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اصل جنگ صرف حقیقی دہشت گردوں کے ساتھ نہیں بلکہ انتہا پسند اسلامیوں کے ساتھ ہے جو دنیا کو مومنوں اور کافروں کے درمیان ازلی جنگ کا میدان قرار دیتے ہیں تو پھر ہم ایک مختصر اور دنیا سے کٹے ہوئے گروپ کی بات نہیں کر رہے ہیں۔ ۱۱ ستمبر کے بعد سے اسامہ بن لادن کو مسلم دنیا کے طول و عرض سے گہری ہمدردیاں حاصل ہوئی ہیں کیونکہ وہ امریکہ کے خلاف کھڑا ہوا ہے۔ اسے کراچی کی کچی آبادیوں سے لے کر بیروت اور قاہرہ کے پیشہ ور ماہرین تک اور برطانیہ اور فرانس میں مقیم پاکستانی اور الجزائری شہریوں تک سب کی ہمدردیاں ملی ہیں۔ مشرق وسطیٰ کے امور کے ماہر ڈینیئل پائپس کے اندازے کے مطابق اس انتہا پسند آبادی کی تعداد کل مسلم دنیا کا ۱۰ اسے ۱۵ فیصد بنتی ہے۔

اسلام میں فاشزم کے اجزاء (Islamo-Fascism)

سوال یہ ہے کہ اس انتہا پسند اسلامیت (redical Islamism) نے کیسے اچانک فروغ پایا ہے۔ سماجی لحاظ سے اس کی وجوہات بیسویں صدی کے اوائل میں یورپی فاشزم کے ابھرنے کی وجوہات سے مختلف نہیں ہوں گی۔ اسلامی دنیا میں ایک بڑی آبادی نے قبائلی زندگی اور روایتی گاؤں سے نقل مکانی کی ہے۔ ان میں سے اکثر شہروں میں آباد ہو گئے ہیں۔ یہاں ان کا تعارف اسلام کی ایک زیادہ تجریدی علمی شکل سے ہوا ہے جو مذہب کے خالص تصور کی طرف واپسی کی دعوت دیتی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے انتہا پسند جرمنی قوم پرستوں نے ایک مردہ نسلی شناخت کو زندہ کرنے کی کوشش کی۔

انتہا پسند اسلام کی نئی شکل مسلمانوں کے لیے بے پناہ کشش رکھتی ہے کیونکہ یہ ان اقدار اور ثقافت کی بحالی کا دعویٰ کرتی ہے جنہیں جدیدیت کے عمل نے مسخ کر دیا ہے۔ چنانچہ یہ کہنے سے معاملہ واضح ہو جاتا ہے کہ حالیہ تنازعہ محض دہشت گردی کے خلاف لڑائی نہیں ہے نہ اسلام کے خلاف بطور مذہب یا تہذیب یہ کوئی جنگ ہے بلکہ یہ جنگ اسلامو فاشزم کے خلاف ہے۔ یعنی اس انتہائی عدم برداشت کے

حامل اور جدیدیت کے مخالف عقیدے کے خلاف جو حال ہی میں مسلم دنیا کے بہت سے حصوں میں ابھرا ہے۔

گزشتہ چند برسوں میں اسلام میں جن انتہا پسند نظریات نے فروغ پایا ہے اس کی زیادہ تر ذمہ داری سعودی عرب پر عائد ہوتی ہے۔ سعودی شاہی خاندان نے گزشتہ برسوں میں وہاں اسلام کی ترویج کے ذریعے علماء کی طرف سے اپنی حکومت کا جواز اور تحفظ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ سعودی حکمرانوں نے اسّی اور نوّے کی دہائیوں میں خصوصاً ۱۹۷۹ء میں مسجد الحرام پر [ایرانیوں کے] ناکام قبضے کے بعد سے اپنے خاص برانڈ کے اسلام کو فروغ دینے کے لیے بہت بڑی سرمایہ کاری کی ہے۔ وہابی نظریے کو بڑی آسانی سے اسلاموفاشزم کے مساوی ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ سعودی عرب میں دسویں جماعت کے طالب علموں کو نصاب میں یہ پڑھایا جاتا ہے کہ ''مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ وفادار رہیں اور کافروں کو اپنا دشمن سمجھیں''۔

سعودی حکمرانوں نے اس عقیدے کا پرچار صرف مشرقِ وسطیٰ تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ خود امریکہ میں بھی اسے پھیلا دیا ہے۔ جہاں انہوں نے اپنے مخصوص اسلام کی ترویج کے لیے کروڑوں کی رقم سکولوں اور مسجدوں کی تعمیر میں صرف کی ہے۔ خلیج سے آنے والی اس رقم سے اسامہ بن لادن اور اس کے پیروکار اس قابل ہوئے کہ وہ اپنے لیے ایک ملک، افغانستان، کو خرید لیں اور اس کو اساس کے طور پر استعمال کرتے ہوئے عرب جنونیوں کی ایک پوری نسل کی تربیت کریں۔ اس عمل کے لیے امریکہ بھی اتنا ہی قصور وار ہے جو روسی فوجوں کے انخلا کے بعد افغانستان سے واپس چلا آیا اور اس نے وہاں ایک مستحکم اور جدید سیاسی نظام کے قیام کی ذمہ داری قبول نہیں کی۔

۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کے عشروں میں اسلاموفاشزم کے فروغ کی آخری وجہ مشرقِ وسطیٰ میں غربت، معاشی بدحالی اور مطلق العنان سیاست ہے۔ یہ وہ عناصر ہیں جن سے سیاسی انتہا پسندی کا خام مال تیار ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اس اصل وجہ کا سراغ لگائیں جو ان وجوہات کے پس پشت موجود ہے۔ اس الزام کی روشنی میں کہ امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کسی نہ کسی طرح ان وجوہات کو دُور کرنے کی کوشش کر سکتے تھے، جو انہوں نے نہیں کی۔

درحقیقت، بیرونی ممالک، عالمی بنک جیسے بین الاقوامی اداروں کے ذریعے مسلمان ممالک کی مدد کرتے رہے ہیں جیسے امریکہ نے مصر اور اردن جیسی اقوام کے ساتھ دوطرفہ معاملات طے کر کے ان کی مدد کی۔ تاہم اس امداد کا بہت کم حصہ کسی اچھے کام آسکا ہے کیونکہ مسلم دنیا میں مسئلے کی اصل نوعیت سیاسی ہے۔ معاشی اور سیاسی اصلاحات کے لیے ہمیشہ سے مواقع موجود رہے ہیں لیکن بہت کم مسلم حکومتوں نے اور عرب حکومتوں نے تو بالکل نہیں، وہ پالیسیاں اختیار کی ہیں جو جنوبی کوریا، تائیوان، چلی یا میکسیکو نے عالمی معیشت کے لیے اپنے دروازے کھول کر پائیدار ترقی کی بنیاد ڈالنے کے لیے اختیار کیں۔

کسی بھی عرب حکومت نے رضا کارانہ حکومت چھوڑ کر جمہوری حکومت کے قیام کے لیے راہ ہموار نہیں کی۔ جیسا کہ ڈکٹیٹر فرانکو کے بعد سپین کی بادشاہت نے کیا، یا تائیوان کے قوم پرستوں نے، یا ارجنٹائن، برازیل، چلی اور لاطینی امریکہ کے دوسرے فوجی آمروں نے کیا۔ کوئی ایک بھی مثال ایسی نہیں کہ خلیج فارس کی کسی دولت مند ریاست نے اپنی دولت خود انحصار صنعتی معاشرے کے قیام کے لیے خرچ کی ہو۔ بجائے اس کے ان ریاستوں نے ایسا بدعنوان دولت مند طبقہ پیدا کیا جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ جنونی اسلام پسند ہوتا چلا گیا۔ مسلم دنیا کے جمود کی اصل وجہ بیرونی دنیا کے کردہ یا ناکردہ گناہ نہیں بلکہ ان کی اپنی ناکامیوں میں پوشیدہ ہے۔

مستقبل کے امکانات

آج امریکہ کو دہشت گردوں کے ایک مختصر گروہ سے نمٹنے کا چیلنج ہی درپیش نہیں ہے بلکہ اسلامو-فاشزم کا سمندر جس میں یہ دہشت گرد تیر رہے ہیں، زیادہ بڑا نظریاتی چیلنج ہے جو بعض اعتبار سے کمیونزم کے چیلنج سے بھی زیادہ بنیادی اور سنگین ہے۔ تاریخ اب یہاں سے کیا رخ اختیار کرے گی؟ کیا انتہا پسند اسلام مغرب پر حملہ کرنے کے لیے زیادہ پیروکار اور زیادہ طاقتور ہتھیار اکٹھے کر لے گا۔ واضح طور پر ہمیں اس کا علم نہیں مگر چند مخصوص عوامل اس ضمن میں ہماری راہنمائی کر سکتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ افغانستان میں جاری طالبان اور القاعدہ کے خلاف اور اس سے بھی آگے عراق میں صدام حسین کے خلاف جنگ کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ لوگوں کے اس خیال کے برعکس کہ

نظریات کی زندگی اور موت کا دارومدار ان کی داخلی اخلاقی توانائی پر ہے درحقیقت اس میں طاقت زیادہ بڑا کردار ادا کرتی ہے۔ جرمنی کا فاشزم اپنے اندرونی اخلاقی تضادات کے سبب شکست وریخت کا شکار نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی موت اس لیے واقع ہوئی تھی کہ جرمنی پر بمباری کر کے اسے راکھ کا ڈھیر بنا دیا گیا تھا اور اتحادی فوجوں نے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ اسامہ بن لادن نے عالمی تجارتی مراکز پر کامیاب حملے کر کے پوری دنیا میں بے پناہ مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ اگر امریکی فوجیں علامتی طور پر، کسی عوامی چوک میں اس کے طالبان محافظین کے ساتھ اسے کسی کھمبے سے لٹکا دیں تو اس کی تحریک اپنی اکثر کشش کھو دے گی۔ اسی طرح اگر فوجی کارروائی غیر مؤثر رہی تو اسلاموفاشزم کو حمایت حاصل ہو گی۔

دوسری اور زیادہ اہم پیش رفت خود اسلام کو اپنے داخل سے برامد کرنی ہو گی۔ مسلمانوں کو یہ فیصلہ کرنا ہو گا کہ کیا وہ جدیدیت کے ساتھ، خصوصاً سیکولر (لادینی) ریاست اور مذہبی برداشت پر مبنی اس کے کلیدی اصولوں کے ساتھ مصالحت کر سکتے ہیں یا نہیں؟ مسلم دنیا آج اسی دوراہے پر کھڑی ہے جہاں مسیحی یورپ سترہویں صدی میں تیس سالہ جنگ کے دوران کھڑا تھا۔ مذہبی سیاست لامحدود جھگڑوں کو جنم دے رہی ہے۔ یہ جھگڑے صرف مسلموں اور غیر مسلموں کے درمیان نہیں بلکہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان بھی ہیں۔ (پاکستان میں اکثر حالیہ بم دھماکے سنی-شیعہ تنازعہ کے نتیجے میں ہوئے ہیں۔) حیاتیاتی اور نیوکلیائی ہتھیاروں کے اس دور میں یہ صورت حال سب کے لیے تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے۔

یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ سیاسی لادینیت (سیکولرزم) کی داخلی منطق کی بنا پر اسلام کی ایک زیادہ آزاد خیال (لبرل) شکل سامنے آئے۔ اسلامی تھیوکریسی لوگوں کو اپنی مجرد شکل میں زیادہ پرکشش نظر آتی ہے۔ جنہیں اس قسم کی حکومتوں کے تحت عملاً رہنے کا موقع ملا ہے، مثلاً ایران یا افغانستان میں، انہیں زیادہ متشدد آمریت کا تجربہ ہوا ہے۔ ان کے لیڈر غربت اور جمود کے مسائل پر قابو پانے میں زیادہ بے سمت ثابت ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ ۱۱ ستمبر کے واقعات کے بعد تہران اور دیگر ایرانی شہروں میں اسلامی حکومت سے تنگ آئے ہوئے لاکھوں نوجوانوں نے زیادہ آزاد سیاسی نظام کے حق میں مظاہرے کیے۔ ان کے لیے ''مرگ برامریکہ'' کے سابقہ نعرے ''امریکہ ہم تم سے محبت کرتے ہیں''، جیسے نعروں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ حتیٰ کہ اس دوران بھی نعرے لگائے گئے جب پڑوسی افغانستان میں طالبان پر امریکی بمباری جاری